**Majallah-yi Talim o Tahqiq**

مجلہ تعلیم و تحقیق

Markaz Talim o Tahqiq, Gulshan-e-Taleem,
Sector H-15, Islamabad, Pakistan

مرکز تعلیم و تحقیق، گلشنِ تعلیم، ایچ۔۱۵، اسلام آباد، پاکستان

**ISSN (P):** 2618-1355, **ISSN (Online):** 2618-1363

Issue 2, Vol 3,April-June pp 41-53

شمارہ ۲، جلد ۳، اپریل–جون صفحات ۴۱۔۵۳

# فقہ اسلامی میں تقابلی مطالعہ (فقہ مقارن) کے رجحانات (تحقیقی جائزہ)

## Trends in comparative study (comparative jurisprudence) in Islamic jurisprudence- Research Overview

مسلمہ عبدالمالک [1]

ثمینہ سعدیہ [2]

**Abstract:**

This paper discusses various trends in comparative study of Islamic law and some methodological implications of its development. Different Islamic jurisprudence has developed over fourteen centuries. Over that span of time, various schools of jurisprudence have emerged, each with its own interpretation and application of the Sharia. This paper attempts to address the question how a balance approach may be developed in various schools of thought to collaborate between scholars from different parts of the world.

. Due to complicated contemporary issues and changes in custom and usage, it is difficult to resolve the issues by a school of thought. comparative study of Islamic law may help to resolve such kind of complicated issues. The conclusions will set out some of the issues that may be important for further comparative studies .

**Keywords:**

Fiqh Muqaran, complications, issues, circumstances, comparative methodology

**Receiving Date:**
10 April 2021
**Acceptance Date:**
28 June 2021
**Publication Date:**
**30** June **2021**

-1 پی ایچ ڈی سکالر، شیخ زاید اسلامک سینٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور

-2 اسسٹنٹ پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سینٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور

فقہ اسلامی محض زندگی کے چند جزئی مسائل کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ قانونی و اخلاقی مجموعہ ہے جو انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام معاملات میں راہنمائی کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ میں علم کی ایسی طلب اور جستجو پیدا کر دی تھی کہ ہر فرد دینی و دنیاوی امور سے متعلق احکامِ شریعت جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا۔ لہذا صحابہ کرام ؓمیں نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفس کے نتیجے میں طلب علم اور فہم دین کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی پیدا ہوئی۔ صحابہ کرام ؓ اور تابعین ؒ کے بعد آنے والے فقہاء و مجتہدین نے اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق قرآن و سنت کی روشنی میں اجتھاد و استنباط کے ذریعے مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کی۔

فقہ اسلامی کی تاریخ میں بیسویں صدی اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے نصف کے آخر میں عالم اسلام میں پیش آنے والے جدید مسائل پر غور و فکر کرنے اور ان مسائل کا شرعی حل نکالنے کے لئے ایک اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کو فقہ مقارن کا نام دیا گیا۔ اس تحریک نے مسلم معاشرے میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک نئے فقہی رجحان اور منہج اجتہاد کو متعارف کرایا۔ اس نئے نظریے اور رجحان کا مقصد یہ ہے کہ عرف و عادت کی تبدیلی کی وجہ سے امت مسلمہ کو درپیش مسائل کا حل کسی ایک متعین فقہی مکتب کے پاس نہیں بلکہ ایک مشترکہ اجتماعی فقہ کے پاس ہے جس میں کسی بھی مسئلے کا حل کسی ایک خاص مکتب فکر کی بجائے تمام مکاتب فکر کو سامنے رکھ کر نکالنا ہے۔ اسی فکر نے فقہ مقارن (تقابلی مطالعہ) کے اسلوب کو اجاگر کیا۔ زیر نظر مقالہ میں فقہ مقارن کے معنی و مفہوم اور عصر حاضر میں پیچیدہ معاشی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے "فقہ مقارن" کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور اجتماعی اجتہاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

## فقہِ مقارن۔ تعارف

فقہِ مقارن جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کسی بھی فقہی مسئلہ میں مجتہدین کی متعدد و متنوع آراء میں موازنہ و مقارنہ کے بعد قوی دلائل کی بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کا نام ہے۔ فقہِ اسلامی کے ابتدائی ادوار میں اس کے لیے 'علم الخلاف' کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔
محمد سعید رمضان البوطی فقہِ مقارن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقہی مسائل میں مختلف فقہی مسالک کی آراء کو جمع کرنا اور ان میں تقابلی مطالعہ کرنا فقہ مقارن کہلاتا ہے۔"[3] فقہ مقارن میں عموماً اختلافی مسائل پر بحث کی جاتی ہے، اور مسئلہ کی صورت، مختلف فقہاء و مجتہدین کی آراء، ان کے دلائل، منشاء اختلاف مناقشہ و ترجیح جیسی ابحاث کی جاتی ہیں۔

محمد تقی الحکیم کے مطابق:

جمع الآراء المختلفة فى المسائل الفقهية والموازنة بينها بالتماس ادلتها وترجيح بعضها على بعض"[4]
یعنی فقہی مسائل میں مختلف فقہی آراء کا جمع کرنا اور دلیل کے ساتھ ان کا موازنہ کرنے کے بعد دلیل کی بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دینا فقہ مقارن کہلاتا ہے۔

---

3- محمد سعید رمضان البوطی، محاضرات فی فقه المقارن، (دار الفکر دمشق۔ سوریۃ، الفکر المعاصر بیروت۔ لبنان، ۱۹۸۱ء)، ص۶

4- سید محمد تقی الحکیم، الاصول العامة للفقه المقارن، (المجمع العالمی لاھل البیت، ۱۹۹۷ء)، ص۹

محمد فتح الدرینی لکھتے ہیں:

الفقه المقارن: تقرير آراء المذهب الفقهية الاسلامية فى مسألة معينة ، بعد تحرير محل النزاع فيها، مقرونة بأدلتها، ووجوه الاستدلال بها، وما ينهض عليه الاستدلال من مناهج أصولية، وخطط تشريعه، وبيان منشأ الخلاف فيها، ثم مناقشة هذه الأدلة أصولياً، والموازنة بينها، وترجيح ما هو اقوى، دليلاً، او أسلم منهجاً، أو لإتيان برأى جديد، مدعم بالدليل الأرجح فى نظر الباحث المجتهد"[5]

درج بالا تعریف کی روشنی میں فقہ مقارن کی بنیادی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

☆ فقہ مقارن بنیادی طور پر مسلم معاشرے کے اجتماعی مسائل اور ان کے حل کے لئے اجتماعی اجتہاد کا نام ہے۔ اس اجتہاد کے منہج و اسلوب میں قرآن و سنت کے اصول، مقاصد شریعہ، سد الذرائع، مصلحت عامہ، فقہی قواعد، تلفیق اور جمع بین المذاہب شامل ہیں۔

☆ فقہ مقارن میں کسی بھی معین فقہی مسئلہ میں مختلف مسالک و مکاتب فکر کی آراء کو ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ فقہاء کے اختلاف اور وجہِ اختلاف کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یعنی فقہی اختلافات کے اسباب فقہ مقارن کا موضوع ہیں۔

☆ مختلف فقہی آراء جن دلائل پر مبنی ہوتی ہیں، ان کا ذکر کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ ہر پہلو کا جائزہ لیا جاتا ہے اور پھر ان دلائل کی بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

☆ آئمہ مجتہدین کے اصول و قواعد اور جن اصولوں کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ فقہ مقارن میں بعض اوقات کسی نئے مسئلے کے حل کے لئے کوئی نئی رائے بھی پیش کی جاتی ہے جو مجتہد کی نگاہ میں دلیل کے لحاظ سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

☆ مجتہد دراسات عربیہ میں مختلف علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔[6]

فقہ مقارن امت مسلمہ کی ایک مشترکہ اور اجتماعی فقہ کا نام ہے۔ جس کی نمایاں خصوصیات مختلف فقہی و قانونی مسائل پر یکساں مؤقف اور یکساں منہج استدلال ہے۔ یہ فقہی آراء و نظریات پورے عالم اسلام میں تقریباً یکساں ہیں اور ان آراء کے پیچھے اصول اجتہاد و استدلال بھی ایک جیسا ہے۔ اس یکساں انداز فکر اور اصول کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فقہ جدید قانونی فکر کی طرح اپنے اندر صراحت و بیانت لیے ہوئے ہے۔ عصر حاضر میں متعدد جدید معاشی، طبی اور معاشرتی مسائل میں اجتماعی اجتہاد کے ادارے مثلاً فقہ اکیڈمی انڈیا، المجمع البحوث الاسلامیہ اور اس طرح کے دیگر فقہی ادارے فقہ مقارن کا سہارا لیتے ہیں۔ اور جو رائے عصری حالات میں زیادہ موزوں نظر آتی ہے اسے اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے اداروں کا مقصد بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ مختلف فقہی آراء کا دلائل سے جائزہ لیا جائے اور باہمی مشاورت کے نتیجے میں کسی ایک رائے کو اختیار کر لیا جائے۔

عبد المجید السوسوۃ اشر فی فقہ مقارن یا اجتماعی اجتہاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

5- فتح الدرینی، ڈاکٹر، بحوث مقارنه فى الفقه الاسلامى واصوله، (مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۸ء) ص ۲

6- مصدر سابق، ص ۲۸، سلیمان الاشقر، مسائل فى فقه المقارن، (دار النفائس للنشر والتوزیع اردن، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۱

"هو استفراغ اغلب الفقہاء الجهد لتحصيل ظن بحكم شرعی بطريق الاستنباط واتفاقهم جميعا او اغلبهم على الحكم بعد التشاور"[7]

یعنی فروعی فقہی مسائل میں فقہاء و مجتہدین کی ایک ہی مسئلے سے متعلق متنوع آراء فقہ مقارن ہے۔ ظنی مسائل فقہیہ میں اختلاف قابل قبول اور محمود ہے جبکہ قطعی شرعی احکام میں اختلاف و اجتہاد نا قابل قبول اور مذموم ہے۔ فقہ مقارن میں ظنی احکام پر متنوع آراء میں سے کسی ایک رائے کو دلیل کی بنیاد پر ترجیح دینا ہے۔ فقہ کے تدوینی دور سے ہی فقہ مقارن کی بنیاد پڑ گئی تھی چنانچہ فقہ حنفی کی کتب ظاہر الروایہ[8] اور نادر الروایہ[9] میں امام ابو حنیفہؒ کی آراء کے پہلو بہ پہلو امام شافعی و امام مالکؒ وغیرہ کی آراء کا بھی ذکر کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ اسلوب ترقی کرتا گیا۔ سائنسی ایجادات کا دائرہ وسیع ہوتے ہی اتنے ہی مسائل رونما ہوتے گئے جن کا حل کسی ایک مکتب فکر کی فقہ کے مطابق مشکل ہو گیا۔ لہذا اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ مسائل کا حل مختلف مکاتب فکر کی روشنی میں بقدر ضرورت نکالا جائے۔ اس کو مختلف مکاتب فکر کا مجموعہ یا باب الاختلاف بھی کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر منصوری لکھتے ہیں:

" فقہ مقارن کی تدوین میں انیسویں اور بیسویں صدی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس صدی میں عالم اسلام میں پیش آنے والے نت نئے مسائل پر غور کرنے اور اس کا شرعی حل نکالنے کے لئے ایک منظم اور اجتماعی تحریک کا آغاز کیا گیا ۔ جسے 'فقہِ مقارن' یا 'اجتماعی اجتھاد' سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اجتماعی اجتہاد، فقہاء و مجتہدین کا باہمی مشاورت اور اجتماعی غور و فکر کے ذریعہ غیر منصوص مسائل کا شرعی حل کسی ایک غالب رائے کو اختیار کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ مشاورت فقہی مجالس اور فقہاء کے اجتماعات کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ان مجالس میں فقہاء پیش آنے والے مسائل کا حل مشاورت اور اجتہاد کے ذریعہ کرتے ہیں۔"[10]

ڈاکٹر محمود احمد غازی فقہِ مقارن یا اجتماعی اجتھاد کو فقہِ عالمی کا نام دیتے ہیں:

" گلوبلائزیشن اور جدید تہذیب کی وجہ سے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے "فقہ المقارن" کا رجحان روز بروز تقویت حاصل کرتا جا رہا ہے تاکہ تمام مذاہب فقہیہ اور تمام فقہاء اسلام کے فقہی ذخیرے اور ورثے کو مشترکہ فکری ورثہ قرار دیا جائے۔ یعنی ایسی فقہ وجود میں آئے جو فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی کے نام کے ساتھ منسوب نہ کی جائے بلکہ اس کو صرف فقہ اسلامی کے نام سے ہی منسوب کیا جائے۔ اور یہ نئی "اجتماعی فقہ " معاصر فقہاء کی اجتماعی کوششوں کے نتیجے میں آ رہی ہے۔

-7 عبد الحمید السوسوہ اشرفی، الاجتہاد الجماعی فی التشریع الاسلامی، (وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیۃ، ۱۴۱۸ھ)، ص ۴۶

-8 ظاہر الروایہ سے مراد وہ چھ کتب ہیں جو فقہ حنفی کی اساس ہیں۔ جو "المبسوط، الزیادات ،الجامع الصغیر،الجامع الکبیر،السیر الصغیر،السیر الکبیر ہیں۔ ان کو ظاہر الروایہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی نسبت واضح اور مضبوط ہے۔

-9 وہ روایتیں جو امام محمد کی کتب ستہ کے علاوہ دیگر کتابوں میں مذکور ہیں وہ نادر الروایہ کہلاتی ہیں کیونکہ ان کی سند و نسبت پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اور ان کا درجہ ظاہر الروایہ کے بعد آتا ہے۔

-10 طاہر منصوری، ڈاکٹر، اجتماعی اجتھاد، تصور وارتقاء و عملی صورتیں (ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد)، ص ۶۳

جس میں کسی بھی شرعی مسئلے کا حل تمام مکاتب فکر کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔"[11]

## فقہ مقارن کا تاریخی پس منظر

تدوین فقہ کے ابتدائی ادوار میں فقہاء صرف مختلف آراء ذکر کرتے جبکہ دلائل ترجیح صرف اپنے مسلک کے ہی بیان کرتے۔ مثال کے طور پر اگر فقہ شافعی کی کتاب ہے تو اس میں فقہ شافعی کے ہی ترجیحی دلائل موجود ہوتے اور اگر فقہ حنفی کی کتاب ہے تو فقہاء کی مختلف آراء ذکر کرنے کے بعد ترجیح کے دلائل فقہ حنفی کے ہی دیے جاتے۔ لیکن دور حاضر میں فقہ مقارن کے اسلوب کے تحت کسی بھی اختلافی مسئلہ میں فقہاء کی آراء ذکر کرنے کے بعد دلیل کی بنا پر بغیر تعصب کے مختلف آراء میں سے کسی ایک رائے کو لیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر فقہ حنفی کی کتاب ہے تو اس میں کسی فقہی مسئلہ پر فقہاء کی آراء ذکر کرنے کے بعد دلیل کی بنیاد پر کسی دوسرے مسلک یا مکتب فکر کی رائے کو اختیار کیا جاتا ہے۔ فقہ مقارن کی نشأت اور ضرورت بیان کرنے کے لیے فقہ مقارن کے تدریجی و تاریخی ادوار کا مختصر جائزہ لیا جائے گا اور عصر حاضر میں فقہ مقارن کے منہج پر تبصرہ کیا جائے گا۔

## فقہِ مقارن پہلی تا دوسری صدی ہجری

فقہ کی ابتدا نبی اکرم ﷺ کے زمانے سے ہی ہو گئی تھی۔ لیکن باقاعدہ طور پر مدون نہیں کی گئی۔ یہ دور اسلامی جواہر کو پروان چڑھانے اور نشوونما دینے کا دور تھا۔ ایک صالح اور اجتماعی زندگی کے جو مسائل ہو سکتے ہیں بس وہ تھے اور انہی کے مثبت و منفی پہلوؤں کی وضاحت تک نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات تھیں۔ " اس دور میں صحابہ کرام ؓ کو جس مسئلہ میں کوئی ابہام یا مشکل در پیش ہوتی تو آپ ﷺ اس کی توضیح فرما دیتے۔ عہد نبوی ﷺ میں اسلام کا دائرہ عرب تک محدود تھا۔ ضرورتیں محدود اور مسائل و وسائل مختصر تھے۔ اس لئے اس کے نظام حیات کے جزئیات کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور نہ ہی ایسے حالات و واقعات پیش آئے کہ ان کے حل کے لئے قیاس یا اجتہاد کی ضرورت پیش آتی کہ ہر زمانہ کی ضروریات و حاجات کے پیش نظر ہر عام شخص اس سے فائدہ حاصل کر سکے۔"[12]

ڈاکٹر عبد الکریم زیدان اس دور میں اجتہادِ نبویؐ کی مثال دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"اس دور میں فقہ صرف وحی الٰہی تھی۔ لیکن بعض مقامات پر نبی اکرم ﷺ نے خود بھی اجتہاد کیا اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تلقین کی۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا کیونکہ اس کی بارے میں کوئی وحی تب تک نہیں آئی تھی چنانچہ نبی ﷺ نے حضرت ابو بکر و عمر ؓ سے مشورہ لیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فدیہ لینے کا مشورہ دیا جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے مخالف تھی پس نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو بکر ؓ کی رائے پر فیصلہ کیا۔"[13] آپ ﷺ کا صحابہ سے مشورہ کرنا اور متنوع آراء میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنا فقہِ مقارن ہی کی ایک شکل تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود نبی ﷺ نے اجتہاد کی تربیت دی اور حضرت ابن عباس ﷺ کو دعا دی اور فرمایا: "اللهم فقهه في الدين "[14] ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر انہیں

---

11۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، عصر حاضر میں اجماع اور اس کا طریق کار مشمولہ عصر حاضر میں اجتہاد اور اس کی قابل عمل صورتیں، (شیخ زاید اسلامک سینٹر جامعہ پنجاب لاہور)، ص ۲

12۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقه، (الفیصل، ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۱

13۔ زیدان، عبد الکریم، ڈاکٹر، المدخل لدراسة الشريعة الاسلامية، (مؤسسۃ الرسالۃ ناشرون، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۱۷

14۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، (م ۲۵۶ھ)، الجامع الصحيح، (دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ)، كتاب الطهارة، باب: وضع المآء عند الخلاء، ح: ۱۴۳

کسی ایسے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑ جائے جس کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی واضح حکم نہ ہو تو انہیں کیا کرنا چاہئے اس کے جواب میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

" شاوروا فيه الفقہاء العابدين ولا تمضوا فيه رأى خاصه "[15] ایسے میں تم عبادت گزار فقہاء سے مشورہ کرو اور کسی مخصوص رائے پر نہ چلو۔

آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا صحابہ سے مشورہ کرنا اور متنوع آراء میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنا فقہِ مقارن ہی کی ایک شکل تھی۔ نیز یہ کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے صحابہ کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔

خلفائے راشدین کے دور میں فتوحات کے نتیجہ میں اسلام عرب سے پھیل کر عجم تک پہنچا۔ مختلف تمدن سے معاملات در پیش ہونے کے سبب اس دور میں نئے سیاسی و اجتماعی مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ ایسے میں وہ امور و معاملات جن پر نصوص موجود نہیں تھیں صحابہ کرامؓ ان کا حل کتاب اللہ اور سنت رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی روشنی میں نکالتے۔ اگر اس مسئلہ کا حل کتاب اللہ اور سنت رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے نکل آتا تو اس پر اسی طرح عمل کر لیتے اور اگر نہ ملتا تو غور و فکر اور اجتہاد کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل نکالتے۔[16] ایک روایت میں آتا ہے کہ "حضرت ابو بکرؓ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو آپؓ سب سے پہلے اس کا حل کتاب اللہ میں تلاش کرتے اور اگر حل کتاب اللہ میں مل جاتا تو اس کو اسی طرح نافذ کر دیتے۔ اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے۔ اگر سنت میں حل مل جاتا تو اس پر عمل کرتے۔ لیکن اگر سنت میں بھی حکم نہ ملتا تو علماء کو بلاتے اور ان سے مشورہ کرتے پھر اگر کسی رائے پر اتفاق ہو جاتا تو اس کو نافذ کر دیتے۔"[17] "اسی طرح سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلامی حکومت کا دائرہ جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر ایران، شام اور مصر تک پھیل گیا اور اس کے نتیجے میں ایسے مسائل پیش آنے لگے جن کا حل شرعی نقطہ نظر سے مطلوب تھا۔ اس صورت میں حضرت عمرؓ بھی اجتماعی مشاورت کا سہارا لیتے۔"[18] پیش آمدہ اجتہادی مسائل میں متنوع آراء میں سے صائب رائے کے اختیار اور اس پر عمل درآمد کے لیے حضرت عمرؓ کی مستقل مجلس شوری کے ارکان میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور دیگر اکابر صحابہ شامل تھے۔[19] اس کے علاوہ ایک اور اجتہادی مجلس اکابر مہاجرین پر بھی مشتمل تھی۔ نو پیدا شدہ مسائل جن میں مشورہ و اجتہاد کی ضرورت ہوتی ان کا نام "صوافی الامر" رکھا تھا۔[20] پیش آمدہ اجتہادی مسائل میں متنوع آراء میں سے متفقہ صائب رائے کے اختیار میں عہد فاروقی کی سب

15۔ الھیثمی، علی بن ابی بکر، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، (دار الکتب العلمیۃ۔ الناشر، ۱۴۲۲ھ)، کتاب العلم، باب فی الإجماع، ح:۸۳۴

16۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تاج عبد الرحمان العروسی، الفقه الاسلامی فی میزان التاریخ، (دراسۃ تحلیلیۃ مع عرض ادوار و تطوراتہ وخصائص، ۲۰۰۳ھ)، ص ۸۳
تقی امینی، محمد: فقه اسلامی کا تاریخی پس منظر، (اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور)، ص ۵۱

17۔ علی المتقی الھندی، علاؤ الدین (م ۹۷۵ھ)، کنز العمال، تحقیق: بكري حياني- صفوة السقا، (مؤسسة الرسالة، ۱۹۸۱ھ)، كتاب الخلافة مع الامارة، الباب فی خلافة الخلفاء، ۱۴۰۶۳، ۵/۶۰۰

18۔ بحوث مقارنه فی الفقه الاسلامی و اصوله: ص ۷۳، ۷۲

19۔ كنز العمال، كتاب الخلافة مع الامارة، ۱۴۱۹۶ ـ ۵/۶۸۷

20۔ ابن قیم الجوزیۃ، محمد بن أبي بکر (م ۷۵۱ھ) إعلام الموقعين عن رب العالمين، (دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۹۱ء)، فصل فی الرأی المحمود، ۱/۶۶

سے اہم اور نمایاں مثال مفتوحہ اراضی کی تقسیم کا معاملہ ہے۔ ان زمینوں کے بارے میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالی عنہ کی رائے تھی کہ یہ زمین فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے جبکہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عثمانؓ کی رائے تھی کہ زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔ اس موقع پر رائے کے موافق و مخالف جو تقاریر ہوئیں وہ در حقیقت فقہ مقارن پر دلالت کرتی ہیں۔ کسی ایک رائے پر متفق نہ ہونے کی صورت میں حضرت عمر فاروق نے دوبارہ مجلس شوریٰ طلب کی جس میں حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے مہاجرین کے علاوہ انصار کے دس معزز آدمیوں کو بھی بلا بھیجا جن میں قبیلہ اوس کے پانچ صحابہ اور قبیلہ خزرج کے پانچ افراد بھی شامل تھے۔ ان سب کے سامنے حضرت عمر فاروق نے اس رائے کے حق میں کہ زمینیں ان کے اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائیں ایک مدلل تقریر فرمائی۔ آپ کے دلائل سے سب نے اتفاق کیا۔[21] خلفائے راشدین کا اجتماعی مشاورت و اجتھاد کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کا حل نکالنا در حقیقت فقہِ مقارن ہی کی ایک صورت تھی۔

۱۴ھ سے لے کر دوسری صدی کی ابتدا تک کا دور جو کہ فقہِ اسلامی کا تاسیسی دور کہلاتا ہے۔ "اس دور میں مسلمانوں کی باہمی فرقہ بندیاں، فرقوں کے رجحانات و میلانات ایک حد تک باہم مختلف ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے آدمیوں کو ترجیح دیتے۔"[22]

عبد البر قاسم محمد رقمطراز ہیں: "عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد فقہاء صحابہ کسی ایک جگہ مقیم نہیں رہے بلکہ مختلف شہروں اور علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اس دور میں معتزلہ، مرجئہ، قدریہ اور جہنیہ فرقے وجود میں آئے۔ اور بکثرت فقہی اختلافات رونما ہونا شروع ہوئے۔ کیونکہ اسلام عرب سے عجم تک پھیل رہا تھا اور تمدن کی وسعت کی وجہ سے اختلافی مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے۔[23] اس دور میں بھی بنیادی طور پر اجتھاد و استنباط کا وہی طریقہ تھا جو صحابہ کرامؓ کا تھا۔ بعض فقہاء ظاہر النص سے ہی مسائل کے استنباط کو کافی سمجھتے تھے جبکہ بعض علت تلاش کر کے اجتہاد کے ذریعہ مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کرتے۔ "اس دور میں فرقہ بندی شروع ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے جس شخص کا جس فرقہ کی طرف رجحان ہوتا وہ اسی فرقہ سے وابستہ ہو جاتا۔ اور ہر فرقہ سے وابستہ شخص اپنے ہی آدمی کو ترجیح دیتا۔ اس دور میں احادیث کو روایت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور جگہ جگہ علم حدیث کے درس شروع کئے گئے۔ احادیث اور رائے کے استعمال کی حد میں اختلاف رونما ہوا۔ قیاس اور استحسان کا کثرت سے استعمال ہونے لگا۔ فقہاء پر مسائل کا اتنا بوجھ تھا کہ وہ مسائل کے حل کے لئے قیاس اور استحسان کو ہی استعمال کرتے تھے۔[24]

اس دور میں بھی فقہِ مقارن کی ایک صورت مدینہ کے فقہائے سبعہ کی مجلسِ مشاورت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہ مجلس بھی پیش آنے والے مسائل پر اجتماعی اجتھاد کے طریقہ کو اپناتے ہوئے تحقیق اور غور و فکر کر کے مسئلہ کا شرعی حکم مستنبط کرتی۔ یہ دور فقہ اسلامی کی تدوین کی بنیاد بھی کہلاتا ہے کہ اس دور میں فقہی نقطہ نظر سے علماء دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور دو مدرسہ فکر وجود میں آئے۔ ایک حجاز: وہاں کے فقہاء اہل حجاز اور اصحاب حدیث سے مشہور ہوئے۔ اور دوسرا عراق: یہاں کے فقہاء اہل عراق اور اصحاب الرائے سے مشہور ہوئے۔ تبع تابعین کے دور میں فقہ کی باقاعدہ تدوین شروع ہوئی۔ اس دور میں چار فقہی مکاتبِ فکر وجود میں آ گئے تھے۔

---

21۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج، (المطبعۃ السلفیۃ، ۱۳۸۲ھ)، ص ۲۴ تا ۲۷

22۔ تقی امینی، مولانا، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، (دفتر ٹوئنٹیتھ سنچری اسلامک سٹڈی سرکل سعدی پارک لاہور، ب۔ت)، ص ۴۴

23۔ عبد البر محمد قاسم، تاریخ فقہاء، (مکتبہ قاسمیہ ملتان۔ پاکستان، ب۔ت)، ص ۱۷

24۔ مفتی، وحید، حماد اللہ، تاریخ الفقہ والفقہاء، (زمرد پبلشرز، نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی، ب۔ت)، ص ۲۳

ڈاکٹر عبد الکریم زیدان کے مطابق: "اس زمانہ میں اجتماعی اجتھاد کو فروغ ملا۔ اور فقہاء اربعہ میں امام ابو حنیفہؒ نے بطور خاص اس روایت کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے اپنے فقہی مذہب کی بنیاد شوری اور اجتماعی بحث و تحقیق یعنی فقہِ مقارن پر رکھی۔"[25]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ امام ابو حنیفہ کی مجلسِ شوری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: "امام ابو حنیفہ نے اپنا مسلک اپنے اصحاب کے درمیان مشاورت کے ذریعہ مدون کیا تھا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے بلکہ مجلس میں مسئلہ پیش کر کے شرکاء مجلس کی آراء سنتے اور اپنی رائے بتاتے۔ بعض اوقات یہ مباحثہ و مناظرہ ایک ماہ سے زیادہ جاری رہتا یہاں تک کہ کسی ایک رائے پر اتفاق ہو جاتا اور امام ابو یوسف اسے قلمبند کر لیتے۔"[26]

## فقہِ مقارن تیسری تا چھٹی صدی ہجری

بعض باحثین و مصنفین کے نزدیک فقہ مقارن کی نشأت و ارتقاء عباسی دور میں ہوئی۔ اس دور میں صرف اقوال ہی ذکر کئے جاتے تھے۔ جبکہ دلائل کے ساتھ مناقشہ و ترجیح مذاہب اربعہ کے انتشار اور آراء میں اختلاف کے سبب ہوئی۔ اس دور میں فقہِ مقارن کے لیے علم الخلاف کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ تیسری اور چوتھی صدی میں فقہاء نے اس پر توجہ دی اور اختلاف الفقہاء کے نام سے مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ محمد بن نصر المروزی (م 293ھ)[27] غالباً پہلے فقیہ ہیں جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اختلاف العلماء کے نام سے کتاب لکھی۔ ابن الندیم کے مطابق: "أحمد نصر وله من الكتب كتاب اختلاف الفقهاء الكبير كتاب اختلاف الفقهاء الصغير."[28]

کتاب میں مصنف نے اختلافی مسائل اکٹھے کر کے دلیل کے ساتھ ان کو ذکر کیا ہے۔ اور بعض اوقات بغیر تعصب کے دلیل کی بنا پر ترجیح بھی دیتے ہیں۔ اختلافی فقہی مسائل مسئلہ سفیان ثوری کے قول سے شروع کرتے ہیں اور پھر دوسرے فقہاء کی آراء ذکر کرتے ہیں۔ امام ابو بکر محمد بن منذر (م ۳۰۹ھ) نے بھی اختلاف العلماء پر کتاب تحریر کی، جس کے بارے میں شیخ ابو اسحاق شیرازی نے لکھا ہے کہ اس جیسی کتاب کسی اور نے نہیں لکھی: "صنف في اختلاف العلماء: كتبا، لم يصنف أحد مثلها"۔ ان کے بعد محمد بن جریر الطبریؒ (م ۳۱۰ھ)[29] نے اختلاف العلماء کے عنوان سے کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے اپنے زمانے تک کے فقہاء کے اقوال کو نقل کیا ہے۔ ان کے ہم عصر ابو جعفر احمد بن محمد الطحاویؒ (م ۳۲۱ھ)[30] نے بھی اسی نام سے کتاب لکھی جیسا کہ ابن الندیم نے الفہرست میں لکھا ہے: "وله من الكتب كتاب الاختلاف بين الفقهاء

---

25۔ محمد بن حسن الحجوی الثعالبی، الفکر السامی فی تاریخ الفقہ الاسلامی، (دار الکتب العلمیہ بیروت۔ لبنان، ب۔ت) ،۱/۲۸۶؛ اجتماعی اجتھاد، تصور ارتقاء اور عملی صورتیں: ص ۵۴۱

26۔ ڈاکٹر حمید اللہ، امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی، (اردو اکیڈمی سندھ کراچی)، ص ۴۹

27۔ ابو عبد اللہ محمد بن نصر المروزی، امام فی الفقہ والحدیث، زرکلی، الاعلام، (دار العلم الملایین۔ بیروت۔ لبنان)، ۷/ ۱۲۵

28۔ ابن الندیم، ابو الفرج، محمد بن اسحاق (م ۴۳۸ھ)، الفہرست، تحقیق: ابراھیم رمضان، (دار المعرفۃ بیروت لبنان، ۱۴۱۷ھ۔ ۱۹۹۷ء)، ص ۲۶۳

29۔ محمد بن جریر بن یزید الطبری، ابو جعفر المؤرخ المفسر الاسلام، ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ذھبی، محمد بن أحمد، شمس الدین (م ۷۴۸ھ)، میزان الاعتدال فی نقد الرجال، (مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظہ مصر لصاحبہا محمد بن اسماعیل، ۱۳۲۵ھ)، ج ۶، ص ۹۰

30۔ احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ الازدی الطحاوی، ابو جعفر (م ۳۲۱ھ)، الاعلام ، ج ۱، ص ۲۰۶

وهو كتاب كبير۔"[31] صاحب کشف الظنون کے مطابق اسے "اختلاف الروایات" بھی کہا جاتا ہے۔[32] ایک اور مؤلف ابو بکر محمد بن ابراھیم بن منذر نیسابوری(م۳۱۸ھ) کی کتاب کا نام "الاجماع ، والاسراف فی اختلاف العلماء "ہے۔[33] اسی موضوع پر مزید علمی انداز میں ابن عبد البر (م۴۶۳ھ)[34] نے اپنی کتاب "الانصاف، فیما بین العلماءمن الاختلاف" [35] میں بحث کی۔ ابن عبد البر نے کہیں کہیں اسباب اختلاف پر بھی بات کی ہے۔ دلائل بھی بیان کیے ہیں اور اپنے مطابق راجح قول بھی بیان کیا ہے۔ ابن عبد البر کے انداز کو اپناتے ہوئے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے معروف فقیہ ابو محمد عبداللہ بن السید البطلیوسی(م 521ھ )[36] نے اسباب اختلاف الفقہاء پر ایک مستقل کتاب لکھی جو " الانصاف فی التنبيه على اسباب الاختلاف" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک اور مؤلف أبو علي الحسن بن خطیر النعماني(م۵۹۸ھ) کی کتاب کا نام"اختلاف الصحابة،والتابعين،والفقہاء"ہے۔[37]

اس موضوع پر شیعہ عالم شیخ طوسیؒ(م۴۶۰ھ)[38] کا نام بھی سر فہرست آتا ہے جنہوں نے "الخلاف فی الاحکام" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس سے مذاہب اربعہ کے درمیان فقہ تطبیقی اور فقہ مقارن کی راہ ہموار ہوئی۔ اس کے بعد جلیل القدر عالم دین علامہ حلیؒ[39] نے "تذکرہ" لکھ کر شیخ طوسی کی روش کو آگے بڑھایا۔

### سقوطِ بغداد کے بعد فقہِ مقارن

سقوط بغداد ۶۵۶ھ کے بعد کا دور فقہ اسلامی کے جمود کا دور ہے۔ اس دور میں فقہاء کا زیادہ میلان تقلید کی طرف ہو تا گیا جس کے نتیجے میں اجتھاد کا راستہ بند ہو گیا۔ اس دور کے متعلق ڈاکٹر عبد الکریم زیدان لکھتے ہیں: "اس دور میں فقہ نہ تو اپنی پستی سے نکل سکی اور نہ ہی فقہاء کی ریت تبدیل ہوئی بلکہ تقلید کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایسی حالت میں اس دور میں مختلف علاقوں میں ایسے لوگ اٹھے جنہوں نے اجتھاد مطلق کی دعوت دیتے ہوئے کسی ایک مسلک کی قید میں رہنے کی بجائے قرآن وسنت سے احکام مستنبط کرنے کی کوشش کی۔ ان حضرات میں امام ابن تیمیہؒ، ان کے شاگرد امام ابن قیمؒ اور صاحب نیل الاوطار امام شوکانیؒ وغیرہ سر فہرست ہیں۔ ایسے فقہاء کی تعداد کم تھی جبکہ جمہور فقہاء تقلید پر ہی قائم تھے۔ ہر فریق ایک خاص مسلک کا پابند تھا۔ چنانچہ فقہ اسلامی مختلف مراحل سے گزر کر چوتھے دور میں اپنے عروج پر پہنچی اور پانچویں دور میں اس

---

31۔ ابن الندیم، الفہرست، ص۲۵۷

32۔ حاجی خلیفہ، مصطفیٰ بن عبداللہ(م۱۰۶۷ھ)،کشف الظنون عن أسامی الكتب والفنون،(دار الکتب العلمیہ، بیروت،۱۹۴۱ء)، ج۲، ص۱۳۸۵

33۔ مصدرِ سابق، ج۲، ص۱۳۸۵

34۔ ابن عبد البر، ابو عمر، یوسف بن عبد اللہ الاندلسی، تفصیل کے لیے دیکھیے: ابن العماد الحنبلی، عبد الحیٔ بن عماد(م۱۰۸۹ھ)،شذرات الذهب فی أخبار من ذهب،(دارالمسیرۃ بیروت،۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء)، ج۳، ص۳۱۴

35۔ كشف الظنون، ج۲، ص۱۳۸۵

36۔ عبداللہ بن محمد بن السید، ابو محمد(م۵۲۱ھ)، الاعلام ، ج۴، ص۱۲۳

37۔ كشف الظنون، ج۲، ص۱۳۸۵

38۔ الطوسی، محمد بن الحسن بن علی الطوسی: مفسر من علماء الشيعه(م۴۶۰ھ)، الاعلام، ج۶، ص۸۴

پر جمود طاری ہو گیا اور فقہاء اجتہاد کے راستہ کو چھوڑ کر تقلید کی طرف مائل ہوتے گئے۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی اس دور میں انہوں نے مسالک کے احکام کی اصول وضوابط کے مطابق تخریج کی اور مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کو دلیل کی بناپر ترجیح دی۔[40]

## انیسویں صدی تاعصر حاضر

انیسویں صدی کے وسط تک فقہ ایک غیر مدون شکل میں تھی۔ قانون باقاعدہ دفعات کی شکل میں مرتب نہیں تھا۔ اور جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو عدالت کتابوں میں تلاش کر کے اس کا حل نکالتی۔ کہ یہ فتوی یا اجتہاد یہاں اس صورت سے متعلق ہے اور اس کو اس طرح نافذ کرنا چاہیے۔ اسی کی بنیاد پر وہ مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ان اجتہادات اور فتاوی کا حکومت یا حکمرانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سارا مواد ایک آزادانہ علمی سرگرمی کے نتیجے میں وجود میں آرہا تھا۔ ایسے میں ایک ایسا قانون نافذ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں واضح اور دوٹوک احکام ہوں۔ جس کی بناپر حقوق وفرائض متعین ہوں اور عدالت ان قواعد وضوابط کی بناپر فیصلے کر سکے۔[41]

حالات وضروریات ہر زمانہ اور ہر دور میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے وقت اور حالات کو مد نظر رکھ کر ہی صحیح طریقے سے مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ لکھتے ہیں: "انیسویں صدی میں ہی مسلم ممالک کا سیاسی زوال ہوا، اور اکثر مسلم ممالک یورپین استعماری ممالک" برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی اور پرتگال وغیرہ کے زیر آگئے، عثمانی سلطنت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس کے مختلف صوبوں پر قبضہ کر لیا اور مسلم ممالک کے علاقوں کو فتح کرنے کے ساتھ ہی ان ممالک کا سماجی، معاشی، تعلیمی اور قانونی ڈھانچہ بدل کر رہ گیا۔ تعلیمی نظام بھی لادینی طرز پر مرتب کر دیا تاکہ مسلمان بچے بنیادی اسلامی تعلیمات سے نہ صرف بے خبر رہیں بلکہ ان کے دل ودماغ میں الحاد وبے دینی کے بیج بو دیے جائیں، اس کے ساتھ ساتھ عدالتوں میں بھی اسلامی قانون کے بجائے یورپی قوانین نافذ کر دیے گئے۔"[42]

مزید لکھتے ہیں: انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں کے شروع میں مسلم ممالک میں فقہ اسلامی کے مخالف ہی فیصلے کئے جا رہے تھے۔ اسلامی قانون کو مسلمانوں کی زندگی اور ان کے عدالتی نظام سے برطرف کرنے کی سیاسی، علمی اور فکری سازشیں کی جارہی تھیں۔ حتیٰ کہ عائلی قوانین بھی فقہ اسلامی کے مطابق عمل درآمد نہ تھے۔ عصری تعلیمی اداروں اور لاء کالجز میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود مسلمان بھی یورپین ومستشرقین کے خیالات وافکار کا پیکر تھے۔ یہاں تک کہ اسلامی قانون کے بجائے یورپین قوانین کے نفاذ کے خواہشمند تھے۔ مسلمان یورپی اقدار وروایات سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ اسلامی شریعت کے نفاذ کو قدامت پسندی اور پسماندگی تصور کرتے تھے۔[43]

بیسویں صدی میں فقہ مقارن کا اسلوب نکھر تا گیا اور فقہ مقارن پر نہایت جامع اور بہترین تصانیف منظر عام پر آئیں جو فقہی مسائل میں تمام مسالک ومکاتب فکر کا احاطہ کرتی ہیں۔ جن میں وھبہ الزحیلی کی "الفقه الاسلامي وادلته" نہایت جامع کتاب ہے جو فقہی مسائل میں چاروں مکاتب فکر کی آراء کو ذکر کرنے کے بعد دلیل کی بناپر کسی ایک فقہی مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔ موزوں پر مسح کی کیفیت کے بارے میں وھبہ الزحیلی چاروں فقہی مذاہب کی آراء ذکر کرنے کے بعد فقہ شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شافعیہ کے نزدیک اتنی مقدار میں مسح واجب

40۔ عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر، المدخل لدراسة الشريعة السلامية، (مؤسسة الرسالة ناشرون الطبعة الاولى، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴۳

41۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ ادارہ معارف اسلامی)، ص ۲۱۸

42۔ جمال الدین عطیہ، ڈاکٹر، فقہ اسلامی کی نظریہ سازی، (ایفاء پبلشرز)، ص ۱۱

43۔ مصدر سابق، ص ۱۳

ہے جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے۔ کیونکہ شریعت میں مسح کا حکم مطلق ہے۔ جبکہ مالکیہ کے نزدیک موزے کے اوپر کے سارے حصے پر مسح کرنا واجب ہے جبکہ تلوے پر مسح کرنا مستحب ہے۔ احناف کے نزدیک ہاتھ کی تین انگلیوں کی مقدار کے برابر مسح کرنا واجب ہے۔ اسی طرح سر کے مسح کے بارے میں بھی احناف کی یہی رائے ہے جبکہ حنبلیہ کے نزدیک موزے کے اوپر کے حصہ پر مسح واجب ہے کیونکہ حدیث مغیرہؓ میں ہے کہ "میں نے رسول اکرم ﷺ کو موزوں کے اوپر کے حصہ پر مسح کرتے ہوئے دیکھا [44]۔ وھبہ الزحیلی کے نزدیک شافعی کی رائے راجح ترین ہے ۔ مسح کا حکم مطلق ہی رہے گا۔[45] اس کے علاوہ عبدالرحمان الجزیری کی کتاب "الفقه على المذاهب الاربعه" فقہ مقارن کے اسلوب کو واضح کرتی ہے۔ سید السابق کی "فقه السنة" جبکہ جواد مغنیہ کی "الفقه على المذاهب الخمسة" فقہ مقارن پر بہترین کتب ہیں ۔ جن سے دور حاضر میں کسی ایک مسلک کی قید میں رہے بغیر تمام مسالک فقہیہ کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔

پہلے دور میں فقہاء نے اختلافی مسائل میں اپنے اپنے مذہب کو ترجیح دینے کے لئے دلائل اور مخالف مذہب کی رائے میں تردید کی، جسے " علم الخلاف " کہا جاتا تھا۔ جبکہ فقہِ مقارن میں فقہاء اختلافی مسائل فقہیہ میں تردید یا ترجیح دلیل کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ فقہ مقارن کو اختیار کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ مجتہد فقہی قواعد کلیہ سے مکمل معرفت رکھتا ہو۔[46] جیسا کہ مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسائل کا استنباط قرآن و سنت کی روشنی میں کرے۔ اور مسائل کا استنباط تمام مکاتب فقہیہ کو سامنے رکھتے ہوئے کرے اور غیر متعصب ہو کر رائے دے۔ لہذا فقہ مقارن کا علم فقہاء کے فقہی مسائل کے حل میں اختلافات کے نتیجے میں ہوا، جس کے لئے ہر فقیہ نے اپنی رائے کو صحیح قرار دینے کے لئے دلائل دینا شروع کئے۔ پس یہ (فقہ مقارن) متنوع آراء میں اختلاف اور سبب اختلاف بیان کرنے اور غیر متعصب ہو کر متنوع آراء میں سے کسی ایک رائے کو دلیل کی بنا پر اختیار کرنے اور اس رائے کو دلیل کی بنا پر ترجیح دینے کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔ فقہ اسلامی کے علمی ذخیرے میں پہلے ہر فقیہ صرف اپنے ہی مسلک کے دلائل بھی دیتا اور اپنے ہی دلائل کو ترجیح دینے کی بھی کوشش کرتا۔ لیکن بیسویں صدی "فقہ مقارن" کے اسلوب کو اجاگر کرتی ہے جس میں کسی بھی فقہی مسئلے کا حل غیر مقلد ہو کر کسی ایک مکتب فکر کی رائے وفتوی کے بجائے چاروں مسالک و مکاتب فکر کو مد نظر رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مشروط نکاح کے بارے میں احناف کی رائے تو یہ ہے کہ ایسی شرائط قابل ایفاء نہیں ہے۔ ان شرائط کو پورا کرنا ضروری نہیں ہاں دیانتا شوہر ان شرائط کو پورا کر سکتا ہے، جبکہ حنابلہ کے ہاں ایسی شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے اور اگر شوہر ان شرائط کو قبول کرنے کے بعد پورا نہ کرے تو بیوی عدالت میں نکاح کو فسخ کرانے کا اختیار رکھتی ہے۔ "اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اپنے آٹھویں اجلاس 20 یا 24 اکتوبر 1995ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس مسئلے میں ہندوستان کے حالات کے تناظر میں غور و فکر کرنے کے بعد احناف کے مؤقف کے بجائے حنابلہ کے مؤقف کو ترجیح دیتی ہے۔ کیونکہ حنابلہ کا مؤقف اختیار کرنے سے عورت کے لئے یہ فائدہ ہو گا وہ ایسے تحفظات حاصل کر سکتی ہے جس کے ذریعے اس کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے۔"[47]

---

44۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الطہارۃ، باب المسح علی الخفین، ح ۲۰۳

45۔ وھبہ زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، (دار الفکر للطباعۃ والتوزیع والنشر بدمشق ۱۹۸۵ء)، ج ۱، ص ۶۰۹

47۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، نکاح میں شرط تفویض طلاق اور مشروط مہر کا مسئلہ، بشمول جدید فقہی مباحث، 6 ج ۶، ص ۳۳، یہی مؤقف اکثر معاصر فقہاء کا ہے۔ جدید فقہی مباحث، نسیم احمد قاسمی، نکاح میں شرائط مقرر کرنے کا شرعی حکم، (دار الاشاعت، کراچی)، ج ۶، ص ۱۳۱

لہذا اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دور میں عوام الناس کی حالات و ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے مسائل کا استنباط تقلید کے دائرے میں رہے بغیر تمام مسالک فکر کو سامنے رکھتے ہوئے نکالا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں عالم اسلام کے ممتاز فقیہ و مجتہد ڈاکٹر مصطفی الزرقاء ۱۹۹۹ء نے اپنی رائے اجتماعی اجتہاد کے بارے میں پیش کی کہ مسلم ممالک میں اسلامی قانون کو بطور ملکی قانون اختیار کر کے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں دفعہ وار مرتب کرنا چاہیے۔ فقہ اسلامی کے ذخیرے کو سامنے رکھ کر کر انسائیکلوپیڈیاز تیار کر کے فقہ اسلامی کے سارے مسائل واحکامات، قواعد وضوابط کی روشنی میں جمع کیے جائیں تاکہ ان کے ذریعہ آسانی سے فقہ اسلامی کے احکامات سے استفادہ کیا جا سکے۔[48]

مولانا محمد تقی امینی ۱۹۹۱ء ماضی قریب کے نامور فقیہ نے بھی اجتہاد کے موضوع پر دو کتابیں لکھیں۔ ان کے مطابق " اجتہاد کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے جس میں فقہ اسلامی کی مختلف ضروریات کے لحاظ سے ہر ضرورت کے ماہرین ہوں۔ جبکہ ایسی مجلس فقہ حنفی کی تدوین کے وقت بھی موجود تھی۔"[49]

انہی جید فقہاء کی اجتماعی اجتہاد کی روش اور عملی مظاہر نے بیسویں صدی میں فقہ اسلامی کو ایک نئے اور جدید انداز سے متعارف کرایا اور اجتماعی اجتہاد پر بیسویں صدی میں متعدد ادارے بھی قائم ہوئے جو مسائل کا استنباط اور حل تمام مکاتب فکر کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان اجتماعی اجتہادی اداروں میں مجمع البحوث الاسلامیہ، قاہرہ، مصر، المجمع الفقہی الاسلامی، مکہ مکرمہ، مجمع الفقہی الاسلامی، جدہ، یورپین مجلس برائے افتاء شرعی عدالت و تحقیق، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، مجلس شرعی مبارکپور انڈیا، اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان اور وفاقی شرعی عدالتیں ہیں جو اجتماعی اجتہاد کی روش کو آگے بڑھاتے ہوئے جدید مسائل میں لوگوں کی حاجات وضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اجتماعی مؤقف کو سامنے لانے میں بہترین کردار ادا کر رہے ہیں۔[50]

ان اداروں کی اجتماعی اجتہادی کوششوں کے ساتھ ساتھ علماء و مفتیان کرام کی انفرادی اجتماعی کوششیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ پاکستان کے عوام اپنے عباداتی، معاشرتی، عائلی، معاشی زندگی کے مسائل میں مفتیان کرام پر ہی اعتماد کرتے ہیں۔ اور یہ مفتیان کرام اجتماعی اجتہاد کے ساتھ ساتھ انفرادی اجتہاد (فتاوی) کے ذریعہ عوام الناس کے مسائل کے حل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان مفتیان کرام کے اجتہاد پر مشتمل کئی مجموعے "فتاوی جات" کی شکل میں لوگوں تک پہنچ رہے ہیں۔ جن سے کسی ایک مکتب فکر کی قید میں رہے بغیر مختلف مکاتب فکر سے راہنمائی لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ایک ایسا ادارہ ہے جو انڈیا سمیت پوری دنیا میں جدید مسائل کے حوالے سے بہترین اکیڈمی ہے۔ فقہ اکیڈمی نت نئے پیدا ہونے والے مسائل اور عرف وعادت کی تبدیلی اور تغیر کی وجہ سے مسائل کا استنباط اجتماعی غور وفکر اور مشاورتی اجتہاد کے ذریعہ کرتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی تیزی اور افادیت نے بھی علماء وفقہاء کو ان ذرائع کے استعمال کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ اس لئے بعض ادارے فقہی مسائل کے حل کے طریقہ کار کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ آن لائن فتاوی کے لئے ای میل یا براہ راست فتوی کے طریقے کار کو بھی فقہاء نے بدلتی ہوئی ضروریات اور حالات کو دیکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔

پاکستان میں اجتماعی اجتہاد کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی جب یہ پاک سرزمین قائم ہوئی تو اسی وقت اس بات کو پیش نظر رکھا گیا کہ اس ملک میں اسلامی نفاذ کے لئے کس مسلک کی تشریحات کو سامنے رکھ کر کیا جائے؟ اس پر تمام مکاتب فکر کے علماء وفقہاء اکٹھے ہوئے۔ اور اپنی اپنی

---

48- المدخل الفقہی العام، ج۱، ص۲۲۶

49- خالد حسین الخالد، ڈاکٹر، اجتماعی اجتہاد، (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)، ص۲۲۶

رائے پیش کی۔ علامہ سلیمان ندوی ۱۹۵۳ء کی صدارت میں ان حضرات نے متفقہ طور پر بائیس نکات پیش کئے۔ ان بائیس نکات میں سے ایک نقطہ ان حضرات کی اجتماعی اجتہادی صلاحیتوں پر ہے۔[51] پاکستان میں اجتماعی اجتہاد کی کوشش کی ابتدا "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے قیام سے ہوئی۔ جو مفتی محمد شفیع ۱۹۷۶ء اور مولانا یوسف بنوری نے قائم کی۔ اس مجلس نے مختلف تحقیقی مسائل بلا سود بنکاری، مواقیت حج، مشینی ذبیحہ وغیرہ پر فیصلے کئے ہیں۔[52]

بیسویں صدی کے آخر میں فقہ اسلامی پر ایک نئے انداز سے کام کیا گیا۔ اس زمانے میں مسلم ممالک میں اسلامی قوانین وضع کئے گئے۔ اسلامی قوانین کے وضع کرنے میں بھی اسلامی قوانین پر اعتراضات اٹھے۔ یہ اعتراضات مغرب کے ساتھ ساتھ خود اسلامی ممالک کی طرف سے بھی اٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا عالم اسلام کے لوگوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ ایران کے تجربات سے پاکستان نے فائدہ اٹھایا۔ پاکستان سے سوڈان نے فائدہ اٹھایا۔ سعودی عرب سے مصر نے فائدہ اٹھایا۔ جس کے نتیجے میں فقہی مسالک کی حدود دھندلانے لگیں۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام میں باہمی مشاورت اور اشتراک عمل سے اجتماعی اجتہاد کا کام شروع ہو گیا۔ اس اجتماعی اجتہاد کے نتیجے میں فقہی مسالک کی حدود ختم ہو رہی ہیں اور ایک نئی فقہ وجود میں آرہی ہے جس کو نہ ہی فقہ حنفی کہہ سکتے ہیں نہ حنبلی، مالکی اور شافعی بلکہ اس کو اسلامی فقہ ہی کہا جائے گا۔[53] جس میں تقلید کے دائرے سے ہٹ کر چاروں مسالک فکر کی روشنی میں مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

## نتیجہ بحث

موجودہ دور سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ جس میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن گئی۔ معاشی و اقتصادی امور میں نئی نئی ترقیات نے نت مسائل پیدا کئے۔ جو لوگ اسلام اور شریعت کی روشنی میں اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے علماء و مفتیان کرام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اجتماعی اجتہاد کی بنیاد ڈال کر عوام الناس کے مسائل کا حل کسی ایک مسلک کو مد نظر رکھے بغیر چاروں مسالک فقہیہ کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ جو اصول شرع سے مطابقت رکھتا ہو۔ اور ہر دور کے حالات و مقتضیات سے مطابقت رکھتا ہو۔ "فقہ مقارن" کی اس اجتماعی فکر نے فقہی سوچ اور اثر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس سے عالم اسلام میں فتوی و اجتہاد سے وابستہ افراد کے رویے اور سوچ میں لچک و وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس اجتماعی فقہ کے ذریعہ دوسرے مسالک کو پڑھنے، سمجھنے اور ان کی مفید اور قابل عمل آراء کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں مشترکہ فقہ اور اجتماعی مسائل کے حل کے لئے تمام مکاتب فکر کو سامنے رکھ کر یکساں منہج و انداز فکر کو اختیار کر کے کرنا ضروری ہے۔ تاکہ الجھنوں میں گھرے بغیر دلائل کے ذریعہ تمام مکاتب فکر کی روشنی میں مسائل کا استنباط کیا جا سکے۔

### تجاویز و سفارشات

عصر حاضر میں سیاست، معیشت، اور عائلی زندگی سے متعلق متنوع مسائل کے حل کے لیے تمام فقہی مسالک کے اجتہادی اداروں کے ارباب حل و عقد پر مشتمل متحدہ فقہی بورڈز قائم کیے جائیں۔

---

51۔ ابو عمار زاہد راشدی، دور جدید میں اجتہاد کی ضرورت اور دائرہ کار، عصر حاضر میں اجتہاد اور اس کی قابل عمل صورتیں، (شیخ زاید اسلامی مرکز جامعہ پنجاب) ص ۳۰،۲۹

52۔ مصدر سابق، ص ۳۰،۲۹

53۔ تقی امینی، مولانا، اجتہاد، (کراچی، قدیمی کتب خانہ)، ص ۳۶۶

غیر مسلم ممالک میں بسنے والے اقلیتی مسلمانوں کے متنوع اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے علماء امت فقہ مقارن کے تحت ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مطلوبہ اقدامات کریں۔

تمام مسلم ممالک کی حکومتیں فقہ مقارن کو سرکاری سطح پر فروغ دینے کے لیے ٹھوس عملی اقدامات بروئے کار لائیں۔